مرزا محمد رفیع سودا

مصحفی نے سودا کو "قصیدے کا نقاش اول، زبان کا حاکم، قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ" بتایا ہے اور محمد حسین آزاد نے قصیدہ نگاری میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"اول قصائد کا کہنا پھر اس دھوم دھام سے اعلا درجۂ فصاحت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں در عناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے کلام کا زور و شور انوری و خاقانی کو دباتا ہے اور نزاکتِ مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے۔"

اعلا درجے کے فن کار کو خود بھی اپنی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ سودا کو اپنی عظمت کا احساس اور اپنی قصیدہ گوئی پر ناز ہے۔ شعر و سخن میں وہ خود کو انوری، سعدی اور خاقانی کا ہم رتبہ خیال کرتے ہیں۔

انوری، سعدی و خاقانی و مدّاحِ ترا رتبۂ شعر و سخن میں ہیں بہم چاروں ایک

سودا نے غزلیں کہیں، مرثیے لکھے، دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل ہنر قصیدے میں کھلتا ہے اور قصیدے میں بھی مدح سے زیادہ وہ ہجو میں کامیاب ہیں۔ قصیدے سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ انھوں نے انعام و اکرام کی خواہش میں صاحبانِ اقتدار کی مدح سرائی ہی نہیں کی بلکہ اظہارِ عقیدت کے جوش میں بزرگانِ دین کی شان میں بھی قصیدے لکھے۔

مدح گوئی : سودا اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے قصیدے لاثانی اور لافانی ہیں۔ یہ تو سوال ہی نہیں کہ اردو قصیدے کا کوئی نمونہ ان کے سامنے ہو البتہ یہ طے ہے کہ انھوں نے فارسی قصیدے کا مطالعہ نہایت توجہ سے کیا تھا۔ سودا نے بعض فارسی قصیدوں کا جواب بھی لکھا اور کتنے ہی ایسے مقامات ہیں جن میں وہ ان سے آگے نکل گئے۔ قدرت اللہ شوق کی رائے ہے کہ سودا نے خاقانی و عرفی کو قصیدہ

Scanned by TapScanner

...انھیں غزل کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔

سودا غزل اور مرثیے سے زیادہ قصیدے میں کامیاب اس لیے ہوئے کہ ان کے مزاج میں شگفتگی اور دل جوش و امنگ سے معمور تھا، زبان پر کامل دستگاہ تھی۔ فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ بھی پوری طرح تصرف میں تھے۔ گویا قصیدہ گوئی کے سارے سامان فراہم تھے جن سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ سودا کے قصائد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو بزرگانِ دین اور ائمہ معصومین کی شان میں کہے گئے۔ یہ قصیدے محض رسمی نہیں بلکہ جذبۂ عقیدت سے سرشار ہو کے اور پورے خلوص کے ساتھ کہے گئے ہیں۔ دوسرے وہ قصیدے ہیں جو انھوں نے اپنے سرپرست امرا اور محسنین کی مدح میں لکھے۔ ان کے ممدوحین میں سے بعض یہ ہیں: بسنت خاں خواجہ سرا، عالمگیر ثانی، مہربان خاں، احمد خاں بنگش، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، رچرڈ جانسن ریزیڈنٹ لکھنؤ۔ ان قصیدوں میں بھی خلوص کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ آئیے اب سودا کے مدحیہ قصائد کا تنقیدی جائزہ لیں۔

مطلع: قصیدے میں سب سے زیادہ اہمیت مطلع کی ہے۔ جو قصیدے امرا اور اربابِ اقتدار کی شان میں کہے جاتے تھے وہ ان کے روبرو سرِعام یعنی دربار یا کسی اجتماع میں پڑھے جاتے تھے تاکہ صلہ اور ستائش دونوں ہی حاصل ہوں۔ ممدوح کو بھی اصل خوشی اسی وقت حاصل ہوتی تھی جب شاعر شاندار طریقے سے اس کی مدح سرائی کرے اور سیکڑوں ہزاروں حاضرین اس پر واہ واہ کے نعرے بلند کریں۔ مطلع اگر پُرمعنی ہو، اس میں کوئی نئی بات یا کوئی نرالا خیال پیش کیا گیا ہو، اندازِ بیان شگفتہ و پُرجوش ہو تو سامعین کا ہمہ تن گوش ہو جانا لازمی بات ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اب پورا قصیدہ توجہ کے ساتھ سنا جائے گا اور تحسین کا شور خواہ مخواہ اٹھے گا۔ شیخ چاند کا درست ارشاد ہے کہ "خیال کی ندرت، بیان کی جدت اور زبان کی شگفتگی و برجستگی اگر مطلع میں نہ ہو تو وہ کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔" سودا کے مطلعے ایسے شاندار اور شگفتہ ہیں کہ سامع یا قاری کی توجہ کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہوا حمل میں جو مہر کے خاور کا تاجدار　　کھینچے ہے اب خزاں پہ صف لشکر بہار

*

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام　　حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل　　تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

تشبیب: تشبیب میں بڑی گنجائش ہے اور اس میں طرح طرح کے مضامین پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سودا نے اس آزادی سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور تشبیب میں فخر و تعلّی، فلسفہ و اخلاق، شکوۂ دوراں، معاملاتِ حسن و عشق، کیفیتِ بہار اور ان کے علاوہ بھی بہت سے مضامین داخل کر کے قصیدے کے دامن کو وسعت عطا کی ہے۔ اسی لیے بقول قاضی جمال حسین "تشبیب جو دراصل قصیدے کے لیے تمہید کی حیثیت رکھتی ہے، سودا کے یہاں جلوۂ صد رنگ کی صورت نظر آتی ہے۔"

سودا نے آصف الدولہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس کی تشبیب میں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ خوشی مجسم ہو کر خواب میں شاعر کو اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ دونوں کے درمیان سوال و جواب ہوتے ہیں اور تشبیب میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سودا نے یہ مکالماتی انداز فارسی سے لیا ہے لیکن اسے ایسی دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اردو تو کیا بقول پروفیسر محمود الٰہی سوال و جواب کا ایسا دلکش انداز فارسی شاعری میں بھی کم ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک　　دی وہیں آ کے خوشی نے درِ دل پر دستک

پوچھا میں "کون ہے؟" بولی کہ "میں وہ ہوں غافل　　نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا میں ہوں عزیزِ دلہا　　زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

کھول آغوشِ دل اور لے مجھے جلدی ناداں　　پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک"

مندرجہ بالا تشبیب میں جس طرح خوشی کو مجسم مان کر اس سے گفتگو کی گئی ہے اسی طرح دوسری جگہوں پر سودا نے عقل اور حرص وغیرہ کو مجسم مان کر ان کی خامیوں اور خوبیوں کو اور ان سے حاصل ہونے والی نصیحتوں کو مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس مکالماتی انداز کی دلکشی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔

سودا نے بعض جگہ تشبیب میں غزل کو بھی داخل کیا ہے۔ مراد غالباً یہ کہ عاشقی و سرمستی کے اشعار سے تشبیب کے لطف میں اضافہ ہو۔ غزل سودا کے زمانے میں بھی اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف تھی۔ اس لیے بھی سودا نے اسے اپنی تشبیب میں جگہ دی ہوگی۔ دیگر شعرا کی طرح عشق و عاشقی کی طرف سودا کی توجہ بھی رہی۔ اس میں انھوں نے یہاں تک بے اعتدالی سے کام لیا کہ بعض جگہ عشقیہ مضمون کو واسوخت کے درجے تک پہنچا دیا۔ حضرت فاطمہ کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس کی تشبیب بھی

وشعار ہے جیسے رنج چاہنے سے لوٹ شہر ایا ہے۔ اسی طرح ہجو کا رنگ سودا کی طبیعت پر بہت غالب تھا۔ مدحیہ قصیدے میں ہجو کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے لیکن تعلّی وخودستائی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تشبیب میں اپنے حریفوں پر وار بھی کیے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سودا کے بعض قصیدے خطابیہ یعنی بلا تشبیب ہیں۔

گریز: تشبیب کی طرح گریز میں بھی سودا نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ قصیدے میں یہ بڑا نازک مقام ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ مدح کو تشبیب سے پیوست کردے حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی لیے علمائے ادب نے گریز کو ایک ایسے جوڑ سے تشبیہ دی ہے جس کے ذریعے دو سرکش بیل (تشبیب ومدح) ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ سودا اس گر سے خوب واقف ہیں اور تشبیب ومدح کو باہم پیوست کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

سودا کی ایک تشبیب کی مثال اوپر پیش کی جاچکی ہے جس میں خوشی مجسم ہو کر نمودار ہوتی ہے اور سودا کو سمجھاتی ہے کہ مجھ سے بغل گیر ہو جا اور غم واندوہ سے کنارہ کرلے۔

اب تو شیشہ ہے اندوہ کا پتھر سے پٹک

لیکن شاعر کا غم واندوہ سے پرانا رشتہ ہے اسے خوشی سے تعلق قائم کرنا منظور نہیں۔

بے سبب کیونکہ میں اندوہ کی الفت چھوڑوں — کس طرح دوستی غم کی کروں دل سے منفک

اس کے بعد خوشی کہتی ہے کہ آج نواب آصف الدولہ کی سالگرہ ہے اس لیے غم کو چھوڑ اور مجھے یعنی خوشی کو گلے لگا۔ یہی اس قصیدے کی گریز ہے۔ اب اصل شعر دیکھیے۔

کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اس نے کہ مگر — سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک
آج اس شخص کی ہے سال گرہ کی شادی — کہ بصورت ہے وہ انسان و بسیرت ہے ملک
یعنی نواب سلیماں فرو نام آصف جاہ — عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

اس گریز کے بعد مدح کے لیے میدان ہموار ہو جاتا ہے اور تشبیب کا مدح سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔

مدح: قصیدے میں مدح کی مرکزی حیثیت ہے کیونکہ یہی قصیدہ نگاری کا مدعا ہے۔ قصیدہ نگار مدح کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں تخیل کا سارا زور صرف کردیتا ہے۔ اس میں عموماً وہ تخیل کی بے اعتدالی کا شکار بھی ہو جاتا ہے اور ایسی مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے

جس پر مولانا حالی نے شدید اعتراضات کیے ہیں۔ لیکن مبالغے کے بغیر مدح سرائی ممکن ہی نہیں۔ قصیدہ نگار کی اس مجبوری کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

سودا نے بزرگوں کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں وہ تمام اوصاف بیان کیے ہیں جو بزرگوں کی شان کے شایاں ہیں مثلاً ان کی کشف وکرامات، علم وحیا، شرافت ونیک دلی، عبادت و ریاضت اور اسی طرح کے دوسرے قابلِ قدر اوصاف۔ اسی طرح سلاطین وامرا کی سخاوت ودریادلی، عدل وانصاف، تدبر وسیاست، شجاعت ومردانگی اور جاہ وجلال وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ دستور تھا سودا نے مبالغہ آرائی میں کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن یہ اس لیے ناگوار نہیں ہوتی کہ ہم قصیدہ نگاروں کی روایت سے باخبر ہیں۔ ممدوحین کے علاوہ سودا نے ان سے متعلق چیزوں کی بھی تعریف کی ہے مثلاً گھوڑے یا ہاتھی کی تعریف، کسی عمارت کی تعریف یا جنگی سازوسامان وغیرہ کی تعریف۔ سودا نے جن اشعار میں حضرت علی کے روضے کی تعریف کی ہے وہ بطورِ مثال یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

اب کہیں عالم میں اے سودا نظر آتا نہیں — جز پناہ اس آستاں کے موضعِ امن واماں
جس کا پایا قدر ایسا ہے کہ دیکھیں ہیں جسے — تھام کر دستار اپنی عرش کے باشندگاں
کرسی اس گھر کی جو کچھ رکھتی ہے قدر ومنزلت — دیدۂ تحقیق میں یہ عرش کا پایہ کہاں
اس کے قندیل وچراغ آگے یہ خورشید وفلک — جوں چراغِ مضطرب یک قمقمے کے درمیاں

عرضِ مدعا ودعا: قصیدے کے اس آخری جزو میں بھی سودا نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اصل قصیدہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شاعر ممدوح کے سامنے اپنی غرض پیش کرے لیکن اس طرح کہ اس کا مطالبہ بارِ خاطر نہ ہو۔ اس لیے قصیدہ نگاروں نے صاف صاف عرضِ مدعا سے گریز کیا ہے اور اتنا کہہ کر کہ آپ کے قدموں میں جگہ ملی رہے بس یہی کافی ہے، سبھی کچھ کہہ دیا ہے۔ سرفراز الدولہ کے قصیدے میں سودا اپنا مدعا اس طرح بیان کرتے ہیں۔

مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جا گہ — کہ تا بسر کروں لیل ونہار با آرام

قصیدے کے بالکل آخر میں ممدوح کو دعا دی جاتی ہے اور اس میں ممدوح کے مرتبے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک قصیدے میں سودا اپنے ممدوح کے حق میں یوں دعا کرتے ہیں۔

الٰہی تا ہو جہاں تو ہو اور دنیا ہو — جہانِ خوبی ہے تو اے جہانیوں کی پناہ

سودا کی قصیدہ نگاری کے اس جائزے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں اور بقول شیخ چاند ——

"اب چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے اس لیے توقع نہیں کہ اس رنگ میں آئندہ بھی اس کا کوئی جواب پیدا ہو۔"

ہجو نگاری : سودا کے مزاج میں بلا کی شوخی تھی جو بالعموم شرارت کی حد میں داخل ہو جاتی تھی۔ چھیڑ چھاڑ ہمیشہ ان کی عادت رہی۔ نوجوانی میں انھوں نے ایک بزرگ سے ان کا کلام سن کر فرمایا تھا کہ آپ یہ کیا کہتے ہیں ہجو کہا کیجیے۔ یہ سن کر وہ حیران ہوئے کہ میں اور ہجو! آخر میں کس کی ہجو کہوں؟ سودا کا سیدھا سا جواب تھا "یہ کیا مشکل بات ہے میں آپ کی ہجو کہوں آپ میری ہجو کہیے۔" ان کا مزاج تھا کہ کسی نے ذرا ان کے مزاج کے خلاف بات کی اور انھوں نے بخیہ ادھیڑا۔ کسی سے بگڑ جاتے تو اپنے خادم کو جس کا نام غنچہ تھا، آواز دیتے: غنچے! ذرا لانا تو میرا قلم دان۔ دیکھوں تو یہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔ پھر اس کی وہ مٹی پلید کرتے کہ توبہ ہی بھلی۔

انھوں نے جو ہجویں کہیں ان میں سے بعض تو شخصی ہیں جن میں سودا نے اپنے حریفوں کو طنز و تعریض کا نشانہ بنایا ہے اور بعض میں حالاتِ زمانہ کی شکایت ہے۔ شخصی ہجویں ایسے بزرگوں کے بارے میں بھی ہیں جن کے بارے میں ایسے سخت کلمات ناروا تھے لیکن سودا اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ کئی ہجویں ہیں جن میں اپنے زمانے کی خرابی اور زبوں حالی کا ذکر ہے۔ گویا یہ شہر آشوب ہیں۔

شہر آشوب میں کسی اجڑے ہوئے شہر کا ذکر ہوتا ہے یا اس کی بربادی پر ماتم کیا جاتا ہے۔ ایسی نظم جس میں زمانے کی ناقدری کا ذکر ہو وہ بھی شہر آشوب کہلاتی ہے اور عام طور پر اسے ہجو کہا جاتا ہے لیکن یہ ایک ادبی مغالطہ ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے "شہر آشوب —— ایک مطالعہ" میں ثابت کیا ہے کہ شہر آشوب ایک الگ اور مستقل صنف ہے۔ اسے ہجو یا قصیدہ سمجھنا غلطی ہے۔ اس لیے یوں کہنا چاہیے کہ سودا نے مدح گوئی اور ہجو نگاری کے علاوہ قصیدے کی ہیئت میں شہر آشوب بھی لکھے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے بہ اعتبار صنف قصیدہ کو وسعت عطا کی۔

⁂ ⁂